© rasailojaraid.com

نوجوان نسل کا بگاڑ- ذمے دار کون؟

ڈاکٹرنوشادعلی

اسلامی تعلیمات کے مطابق ہر وہ شخص ناکام ونامراد ہے، جو آخرت کے امتحان میں ناکام ہوجائے، خواہ دنیا کی زندگی میں اس نے کتنا ہی عروج حاصل کیا ہو، لیکن صرف دنیا کی زندگی کے اعتبار سے بھی اگر غور کیا جائے تو کسی انسان کا ضمیر اگر اس قدر مردہ ہو چکا ہو کہ اپنے ذاتی فائدے کے علاوہ اسے کچھ نظر ہی نہ آتا ہو تو ایسے شخص کو چالاک، مکار اور خودغرض تو کہا جاسکتا ہے، عقل مند افراد میں اس کا شمار کرنا تو انسانیت کے ساتھ دشمنی ہوگی، ایسے ترقی یافتہ افراد سے تو دیہات کے وہ سیدھے سادے لوگ بہتر ہیں، جن میں غربت اور تعلیم کی کمی کی وجہ سے دوسری کئی برائیاں تو ہوسکتی ہیں، لیکن وہ انسان اور جانور میں فرق کرنا جانتے ہیں، نوجوان نسل کے کارناموں کو دیکھ کر تو کئی بار دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ اے رب رحیم وکریم! میری اولاد کو ایسی ترقی سے محفوظ رکھ، جہاں پہنچ کر وہ اپنوں کو پہچاننے سے بھی انکار کردے۔

ایک صاحب نے شہر کی ایک بہترین کالونی میں ایک کوٹھی خریدی، کوٹھی کا معائنہ کرتے ہوئے، جب وہ اس کی خوبیاں بیان کررہے تھے تو ایک اہم خوبی انہوں نے یہ بھی بتائی کہ بڑا ہی پرسکون ماحول ہے، یہاں شفٹ ہوئے ہم لوگوں کو چھے ماہ سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے، لیکن ابھی تک نہ تو ہم نے ہی کسی سے ملنے کی کوشش کی ہے اور نہ ہم سے ہی کوئی ملنے آیا ہے، پرانے پڑوس کی طرح نہیں ہے کہ جب دیکھو منہ اٹھائے چلے آرہے ہیں، دراصل تعلیم اور جہالت کا یہی فرق ہوتا ہے، یہاں پر سب ہی لوگ پڑھے لکھے اور مہذب ہیں، انہیں نہ اپنی زندگی میں کسی کا دخل پسند ہے اور نہ خود کسی کی زندگی میں دخل انداز ہوتے ہیں۔

غور کیجیے! لوگوں کی سوچ میں کس قدر تبدیلی آچکی ہے، پہلے کہا جاتا تھا کہ بہت ہی ملنسار ہونا خوش اخلاقی کی علامت تھی، لیکن جدید دور میں جب لوگ ایک دوسرے سے ملنا جلنا بند کردیں تو یہ ان کے مہذب ہونے کی علامت تصور کیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جانے لگا۔

میرے ایک غیر مسلم دوست، جو ایک اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز ہیں، کسی دیہات کے رہنے والے ہیں، ایک بار انہوں نے خود بتایا کہ چھتیس سال کی نوکری ہے، لیکن آج تک گاؤں جانا نہیں ہوسکا، والدہ، والد، بہن بھائی سب لوگ ہیں، لیکن نوکری اور گھر کے اتنے کام لگے رہتے ہیں کہ گاؤں جانے کے لیے کبھی وقت ہی نہیں نکال سکا، کبھی کبھی وہی لوگ آجاتے ہیں تو ملاقات ہوجاتی ہے۔

غور کیجیے! چھتیس سال کا عرصہ تھوڑا نہیں ہوا کرتا، میرے مذکورہ دوست کو اس طویل عرصے میں کبھی اتنا وقت نہیں مل سکا کہ خود جاکر اپنے گاؤں والوں، رشتے داروں اور اپنے والدین کی خیر خیریت معلوم کرسکے، وہ جس وقت یہ سب کچھ بتا رہے تھے، میں ان کے چہرے کے تاثرات کو پڑھنے کی کوشش کررہا تھا، میں نے محسوس کیا کہ اپنے کیے پر نہ انہیں کوئی افسوس ہے اور نہ احساس ندامت، ترقی کے غرور سے اکڑا ہوا بالکل بے حس اور سپاٹ چہرہ میرے سامنے تھا۔

انسان کس قدر گھٹیا، نیچ اور پتھر دل ہوسکتا ہے، اس سے متعلق اپنے ساتھ گزرا ہوا ایک واقعہ میرے ایک محترم دوست نے اس طرح بیان کیا:

> شہر کے ایک مشہور ڈاکٹر کے گھر جانے کا اتفاق ہوا، ڈاکٹر صاحب سے ملاقات نہیں ہوسکی، برآمدے میں بیٹھا ہوا ایک شخص رامائن پڑھ رہا تھا، عمر تقریباً 70 سال تھی، بکھرے اور بے ترتیب بال، بڑھی ہوئی داڑھی، میلا کچیلا لباس، پھٹی ہوئی دھوتی، معلوم ہوا کہ وہ محترم ڈاکٹر صاحب کے والد ہیں، کوٹھی کے باہر ایک پیڑ تھا، ہم لوگ وہیں کھڑے ہوکر بات کرنے لگے، ضعیف آدمی نے اپنی داستان غم کچھ اس طرح بیان کی، ہم لوگ مظفر نگر کے ایک دیہات کے رہنے والے ہیں، ڈاکٹر میرا اکلوتا بیٹا ہے، گاؤں میں تھوڑی بہت زمین تھی، زندگی مشکل ضرور تھی، لیکن پھر بھی عزت وسکون کے ساتھ گزر رہی تھی، زمین بیچ کر اسے ڈاکٹر بنایا، زمین بیچ کر ہی اس کا کلینک اور نرسنگ ہوم بنوایا گیا، گھر، گھیر، جانور اور جو بھی تھوڑی بہت زمین باقی بچی تھی اسے بیچ کر یہ کوٹھی بنوائی گئی، سب کچھ بک چکا تھا، لیکن اس کے باوجود میں خوش تھا، میں بھی اپنے کو بڑا آدمی شمار کررہا تھا، سچ بات یہ ہے کہ بڑا آدمی ہونے کا احساس ہی کچھ عجیب ہوتا ہے، بہت دن کھیتی میں ہڈیوں کو پانی کیا، سوچتا تھا اب کچھ عیش کی گزاری جائے، لیکن شہر آکر جلد ہی معلوم ہوگیا کہ عیش کے دن تو وہی تھے، جو میں دیہات میں گزار کر آیا ہوں، جب تک بیوی حیات تھی، پھر بھی غنیمت تھا، لیکن اس کے بعد سے تو حال یہ ہے کہ نوکرانی بھی کھانا اس طرح پٹک کر جاتی ہے، جیسے وہی میری اَن داتا ہے، بیٹا اور بہو،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مجھ سے کبھی بات نہیں کرتے، پوتے کے ساتھ کھیل کر دل بہلانا چاہتا ہوں، لیکن کوئی نہ کوئی بہانہ کر کے اسے بھی بلا لیا جاتا ہے، بوڑھا رو رہا تھا، لیکن آخر میں اس نے جو کچھ کہا وہ بھی ترقی یافتہ معاشرے پر ایک بہترین تبصرہ ہے، بیٹا! یہ جو شان دار بنگلے اور کوٹھیاں تم دیکھ رہے ہو، ان میں انسان نہیں، زندہ لاشیں بسا کرتی ہیں، یہ وہ تعلیم یافتہ، مہذب اور بڑے لوگ ہیں جہاں والدین سے زیادہ کتوں کی قدر کی جاتی ہے۔

اس طرح کے بے شمار واقعات ہم لوگ دیکھتے اور سنتے رہتے ہیں، جو برصغیر کے معاشرے کے ٹوٹنے اور بکھرنے کی دلیل ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ معاشرے میں جو بگاڑ آرہا ہے اس کا اصل ذمے دار کون ہے؟

معاشرے میں بگاڑ کا پہلا سبب: میں سمجھتا ہوں کہ اس کا ایک اہم سبب ہمارا نظام تعلیم ہے، غور کیجیے ہمارے تعلیمی اداروں میں جو تعلیم دی جارہی ہے، اس کا مقصد کیا ہے؟ ڈاکٹر، پروفیسر، انجینئر بناتے وقت ہم انہیں یہی تو تعلیم دیتے ہیں کہ دولت کمانے کا آسان طریقہ کیا ہے؟ گھر سے لے کر کالج تک ہر کوئی بڑا آدمی بننے کی تعلیم دے رہا ہوتا ہے، انسان بنانے کی فکر کسی کو نہیں ہوتی، بڑا آدمی بننے کا یہی جنون انسان کو جائز و ناجائز دولت کمانے پر مجبور کرتا ہے، انسان جب زندگی کے پچیس تیس سال یہی سیکھنے اور سمجھنے میں گزار دیتا ہے تو بڑا آدمی بننے کا یہ جنون اس پر اس قدر سوا ہو چکا ہوتا ہے کہ یہی اس کا مقصد حیات بن جاتا ہے، ہر وہ رشتہ اور تعلق جو اس کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے، اس سے وہ دامن بچانا چاہتا ہے، دوست احباب اور عزیز و اقارب کے ساتھ وقت گزارنا اسے وقت کی بربادی دکھائی دیتا ہے، اپنے مقصد حیات کے سامنے یہ تمام رشتے اسے بونے نظر آنے لگتے ہیں، یہاں تک کہ وہ اپنوں سے اس قدر کٹ چکا ہوتا ہے کہ والدین بھی اسے ایک بوجھ نظر آنے لگتے ہیں اور ان کے لیے بھی وقت نکالنا اس کے لیے مشکل ہو جاتا ہے، معاشرہ بھی عموماً اُنھی لوگوں کو عزت دیتا ہے جن کے پاس دولت ہوتی ہے، اخلاق و کردار اور حرام و حلال ہمارے لیے بے معنی ہو چکے ہیں، اگر ہمارا معیار یہی ہے تو ہمیں خوش ہونا چاہیے کہ ہماری نئی نسل ترقی کی تمام بلندیوں کو چھونے میں لگی ہوئی ہے اور اگر انسانی معاشرے کے لیے اخلاق و کردار کی بھی کوئی اہمیت ہے تو ہمیں اپنے طریقہ تعلیم اور اس کا مقصد، دونوں پر نظر ثانی کی ضرورت ہے۔

دوسرا سبب: نئی نسل کے بگاڑ کا دوسرا اہم سبب یہ ہے کہ ہم لوگ، اپنے چھوٹوں کے سامنے اپنے کردار کا کوئی اچھا نمونہ پیش نہیں کر رہے ہیں، جب ہم ناجائز اور حرام طریقوں سے دولت حاصل کر کے گھر میں لاتے ہیں تو غیر شعوری طور پر ہم لوگ اپنی اولاد کی یہ تربیت کر رہے ہوتے ہیں کہ ہر وہ کام کرو جس میں تمہیں اپنا فائدہ نظر آتا ہے، ہر اس کام سے دور رہو جس میں کسی بھی قسم کے نقصان کا اندیشہ ہو، اب اگر ہر کام کرتے وقت صرف ذاتی نفع و نقصان کو ہی اہمیت دی جانے لگے تو اس اعتبار سے تو بوڑھے والدین کی ذمے داری قبول کرنا فائدے کا سودا تو نہیں ہو سکتا، ہمارا خود کا کردار اگر

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہی ہے کہ معاشرے کے حقوق کی ہمیں کوئی پرواہ نہیں ہے تو آنے والی نسل سے یہ امید کیسے کی جاسکتی ہے کہ وہ دوسروں کے حقوق کی پروا کرے گی، خواہ وہ اس کے والدین ہی کیوں نہ ہوں؟

کسی بھی نسل کا کوئی بگاڑ اس میں اچانک پیدا نہیں ہوا کرتا، برائی ہو یا بھلائی، دونوں ایک نسل سے دوسری نسل کو وراثت میں ملا کرتی ہیں، یہ تو ہو سکتا ہے کہ آنے والی نسل ہم سے دو چار قدم آگے نکل جائے، لیکن یہ بات طے ہے کہ جس خرابی کے برے نتائج آج ہم بھگت رہے ہوتے ہیں، اس کی ابتدا پہلے ہی کبھی ہو چکی ہوتی ہے، لیکن اس وقت جب برائی کی ابتدا تھی تو اس کے برے نتائج کا یا تو ہمیں پوری طرح احساس وشعور ہی نہیں تھا یا پھر ہم نے اس کی اصلاح کی طرف توجہ نہیں کی تھی اور اگر اصلاح کی کوئی کوشش ہوئی بھی تھی تو وہ اس قدر کمزور تھی کہ اس برائی پر قابو پانے میں ناکام ہوگئی، اس بگاڑ سے جڑا ایک اہم ترین سوال یہ بھی ہے کہ والدین کو یہ حق کس نے دیا ہے کہ ان کے ساتھ نیک سلوک کیا جائے، یہ حق اسی مالک کائنات نے دیا ہے جو ہم سب کا رب ہے۔ فرمان نبوی اس بات پر گواہ ہے کہ ہر بچہ نیک فطرت پر پیدا کیا جاتا ہے، یہ ہم انسان ہی ہوتے ہیں جو اسے خدا کا کافر اور نافرمان بھی بناتے ہیں اور مومن مسلم اور مطیع فرمان بھی۔ کسی بچے کی پرورش اگر جانوروں کی طرح کی جائے گی تو جانوروں کی صفات ہی اس میں پیدا ہوں گی، جو شہوت اور پیٹ سے آگے سوچ ہی نہیں پاتے، اولاد کی تربیت اگر اس طرح کی جائے کہ وہ خدا کا شکر کرنے والی بن جائے تو ایسی اولاد سے ضرور توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ تمام انسانوں کے حقوق کی قدر کرنے والی ہوگی، اگر ہم خود ہی اپنے مالک وآقا کے شکر گزار نہیں ہیں تو پھر اس بات کی ضمانت بھی کوئی نہیں دے سکتا کہ ہماری اپنی اولاد بھی ہمارے حقوق کا احترام کرنے والی ہوگی۔

☆☆☆

حضرت مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری رحمۃ اللہ علیہ پہلی مرتبہ جب پاکستان گئے اور وہاں سے تشریف لائے تو بڑی تعریفیں کیں، وہاں کہ لوگ دودھ میں پانی نہیں ملاتے اور عورتیں بے پردہ نہیں ہیں اور یہ ہو رہا ہے، میں نے ساری باتیں سننے کے بعد عرض کیا کہ حضرت ایک بات بتائیے کہ یہ سب جو کچھ ہے، خدا کے خوف سے ہے یا صدر ایوب کے ڈنڈے کا اثر ہے؟ کہنے لگے، بھئی ہے تو ڈنڈے ہی کا اثر! میں نے عرض کیا، پھر اس کی کچھ عمر نہیں ہوتی، ڈنڈے کو گھن بھی لگ سکتا ہے، پانی میں بھی گل سکتا ہے، آگ میں بھی جل سکتا ہے، اس ڈنڈے بچارے کی کیا عمر ہے۔ یہ اصل میں اصلاح ہے نہیں، اصلاح تو درحقیقت خوف خدا سے ہوتی ہے، خوف خدا کے پیدا ہونے کی یہی صورت ہے کہ آدمی اس کے صفاتِ کاملہ کو ذہن میں رکھے کہ حق تعالیٰ نے ہمارے اوپر کتنے کتنے انعامات واحسانات فرمائے، ان کو دیکھے۔ **وفی انفسکم افلا تبصرون** اپنے نفسوں میں نہیں دیکھتے پر تم کیا۔ اللہ تعالیٰ نے کتنی چیزیں کیسی کیسی مشینیں اس کے اندر بنا رکھی ہیں، کس کس طرح کھانا کھاتے ہیں اور وہ ہضم ہوتا ہے، اس سے گوشت بنتا ہے، خون تیار ہوتا ہے، دماغ میں جاتا ہے، اعضائے رئیسہ میں پہنچتا ہے، کیسی کیسی چیزیں بنا رکھی ہیں اس کے اندر۔ ہم نے کچھ خرچ کیا ہے، ان کے اوپر کچھ محنت کی ہے، صرف حق تعالیٰ نے بنایا۔ ایک مشین ہے ذرا سی خراب ہو جائے آدمی رکھا کا رکھا رہ جائے کچھ بھی نہ ہو سکے۔

© rasailojaraid.com